OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

ناول 'بستی' کا اُسلوب و منہج: اسلامی تناظر میں ایک مطالعہ

Style and Methodology of the Novel '*Basti*': A Study in Islamic Perspective

Dr. Azaadar Hussain
E.S.T G.H.S. Sabowal, Sargodha
Hina Ameer (Corresponding Author)
M.Phil. Scholar, University of Sargodha, Sargodha

Abstract

Intizar Hussain is one of the innovators in the style and technique of the Urdu novel. Among the changes that Intizar Hussain made in the style of novels, the most important are the mythological events and Devomalai stories. He has also used different incidents of Islamic history as hints, while story making new experiments at the level of syle. Apart from this, he has made extensive use of other elements of style, such as smile, metaphor, irony, symbolism, due to which his style has become unique. Intizar Hussain's style has based on originality and reality. With regards to the style, they have used everything from the Old Testament, the Gospel, the stories of the prophets, Dev Mala, Buddist, and the attachments of Sophia and have succeeded in creating a style that deserves to be called Urdu novel's new style. In the novel Basti on the one hand, the simplicity of this style attracts the reader, on the other hand, due to the use of different symbols and Devomalai stories. His style has become very layered and patchy.

Key words: style, symbol, elements of style, Devomalai

تمہید

انتظار حسین نے ناول کے اُسلوب میں روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ایک نیا اُسلوب اختیار کیا ہے، جس کی بنیاد علامت نگاری، تمثیلی انداز بیان کے ساتھ ساتھ تاریخ اور تہذیب پر مرکوز نظر آتی ہے۔ انتظار حسین کا اُسلوب موضوع کے مطابق

CC BY

ڈھلتا رہتا ہے۔ بستی چونکہ مکمل ایک تہذیب کا اظہاریہ ہے لہذا انتظار حسین کا اُسلوب بھی اس کی مطابق تشکیل پا رہا ہے۔ بستی میں پیش کی جانے والی تہذیب کا تعلق کسی ایک شہر یا خطہ سے نہیں، بلکہ یہ تہذیب پورے ہندوستان کی نمائندہ تہذیب بن کر سامنے آتی ہے۔ مختلف مذاہب، ان سے منسلک فلسفے، فنون لطیفہ کے قدیم نمونے، تصوف، ادب اور موسیقی کا فن یوں محسوس ہوتا ہے گویا پوری دنیا کو اسی تہذیب میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

تہذیبی عکس: ترقی اور زوال

اسی سلسلہ میں انگریز بھی اس تہذیب کا آکر حصہ بن جاتے ہیں اور یوں اس تہذیب کی ترقی اور عروج کی امیدیں اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔ تاہم جب وقت آتا ہے تو نتائج توقعات سے برعکس سامنے آتے ہیں، جو سب کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ انسان اپنے عزیز و اقارب، تہذیب اور اس کے ماخذات، کھیت کھلیان، مسجدیں، مندر، رسمیں، حتیٰ کہ انسان کو اپنے گھر تک کھونے پڑے ہیں۔ اب ہندوستان کے باسیوں کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ ناول کا کردار ذاکر اسی لیے تاریخ پڑھاتے ہوئے گھبراتا ہے کیوں کہ اس کو تاریخ سے جنم لیتے سوالات کے جواب دینے کی ہمت نہیں۔ ذاکر کی ماں اپنے اجڑے وطن کے کسی درخت کا بھی ذکر کر دے تو ذاکر اور درخت میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تہذیبی دکھ اور ملال انتظار حسین کی تحریروں کا حسن ہے۔ انسانی نسل اور تہذیب اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک خدا کا امر ہو۔ ان کے ناول بستی کا آغاز ہی ایسے اُسلوب سے ہوتا ہے:

> جب دنیا ابھی نئی نئی، جب آسمان تازہ تھا اور زمین ابھی میلی نہیں ہوئی تھی، جب درخت صدیوں میں سانس لیتے تھے اور پرندوں کی آواز میں جگ بولتے تھے کتنا حیران ہوتا تھا، وہ اردگرد کو دیکھ کر کہ ہر چیز کتنی نئی تھی اور کتنی قدیم نظر آتی تھی۔ نیل کنٹھ، کھٹ پٹ بڑھیا، مور، فاختہ، گلہری، طوطے جیسے سب اس کے سنگ پیدا ہوئے، جیسے سب جگوں کے بھید سنگ لیے پھرتے ہیں۔ مور کی جھنکار لگاتار روپ نگر کے جنگل سے نہیں برندابن سے آرہی ہے۔[1]

درج بالا حوالہ میں معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین نے اپنے اُسلوب کے لیے الگ الگ راستے کا انتخاب کیا ہے۔ روایت سے انحراف کیا اور جدید اُسلوب کو اختیار کیا ہے، جس میں علامت اہم عنصر بن کر سامنے آئی ہے۔

علامت نگاری: نئی جہتیں

علامت انتظار حسین کے اُسلوب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس کہانی میں بندر ایک علامت کے طور پر قاری کے سامنے آتا ہے۔ ڈارون کا انسان اور بندر کے سلسلہ میں نظریہ بہت اہم ہے۔ مصنف نے کئی جگہوں پر بندر کو انسان کی جگہ پر دکھایا ہے۔ یہ بندر دنیا کے کئی جنگلوں سے اٹھ کر آئے ہیں اور آکر اس تہذیب کا حصہ بنے ہیں۔ کبھی آریاؤں کی شکل میں تو کبھی کسی شکل میں انھوں نے اس تہذیب پر شب خون مارا ہے۔ اسی طرح بجلی کے کھمبے، سڑکیں اور ریل کی پٹڑی اس تہذیب میں ترقی کے استعارے کے طور پر نظر آتے ہیں۔ مصنف نے بجلی کے کھمبوں اور ان پر لگی سلاخوں کے زاویہ سے بننے والے انگریزی لفظ T کو صلیب سے تشبیہ دے کر ایک خاص معنویت پیدا کی ہے۔ مشرقی تہذیب کے لیے یہ بجلی کے کھمبے موت کی علامت ہیں اور یہاں کے لوگوں کی لاشیں اسی صلیب پر لٹکتی نظر آئیں گی۔ نئے دور کی شروعات مقامی لوگوں کے لیے کشش کا سبب تھا۔ انتظار حسین کی علامت نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> مثال کے طور پر انتظار حسین بیک وقت ناول کے وسیع حجم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاتکوں، استعاروں، علامتوں، اشاروں، کنایوں، اسطوری واقعات، دیومالائی قصوں اور اسلامی تاریخ کے ناقابلِ فراموش

کرداروں کے تلمیحاتی حوالوں کو ایک لڑی میں شگفتہ زبان کے سہارے پرو کر ایک شگفتہ اُسلوب کو تخلیق دیا ہے۔[2]

قصہ گوئی، تاریخی اور ثقافتی حوالے

انتظار حسین قصہ گوئی کے فن کے ماہر ہیں۔ داستانوی ادب کے مطالعہ، اپنی بزرگ خواتین کی سنائی گئی کہانیاں، قصے اور حکایات ان کے حافظہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ انھی قصوں کہانیوں سے انھوں نے اپنے ناول کے موضوعات اٹھائے ہیں۔ انتظار حسین نے اِس ناول کے ذریعے تاریخ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا آغاز بھی قرآن مجید کی سورہ بلد سے ہوتا ہے۔ اس بلد یا قریہ کی اہمیت آگے جا کر اور بڑھ جاتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا محبوب ان گلیوں میں چلتا رہا۔ یہاں نا صرف اللہ تعالیٰ کو یہ شہر پسند ہے، بلکہ حضرت محمد ﷺ کو بھی یہ شہر محبوب ہے، اسی لیے جب آپ ﷺ ہجرت فرمانے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے مکہ مجھے تو بہت عزیز ہے مگر یہاں کے لوگ مجھے رہنے نہیں دیتے۔ بستی کے اُسلوب کی یہ خوب صورتی ہے کہ مصنف نے قرآنی قصہ سے مدد لے کر تاریخ کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کے شروع میں کھٹ بڑھیا، نیل کانٹھ،، گلہری، فاختہ اور جنگل کا بیان ملتا ہے۔ کھٹ بڑھیا کا ذکر ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ سے جوڑنا اور گلہری کو رام چندر جی سے منسوب کرنا جیسے کئی واقعات ناول کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتے ہیں، جس سے ناول کے موضوع کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انتظار حسین نے برصغیر میں جنگوؤں اور غدر کا بیان کر کے قاری کو نا صرف ماضی سے واقفیت دلائی ہے بلکہ مستقبل سے بھی خبر دار کیا ہے۔ مہابھارت، رامائن، احادیث اور قرآن کی روشنی میں زلزلوں کی وجوہات اور زمین کی بناوٹ پر بھی ایک خاص انداز میں بات کی ہے۔

ماضی پرستی اور سیاسی پس منظر

بستی جب لکھنا شروع کیا گیا، وہ وقت مشرقی پاکستان کی سنگینی کا وقت تھا۔ اس دور میں انتظار حسین کے اُسلوب کی تشکیل میں ماضی پرستی کے عناصر کارفرما تھے۔ ایک آمر کی زیر سایہ انتخابات ہوئے مگر عوامی رائے کو اہمیت نہ دی گئی۔ سیاسی طاقتوں کو طاقت کے بل بوتے پر توڑنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے قبل کی کہانیوں میں 1947ء کے واقعات کے ذریعے 1857ء کی تقسیم کے حالات و واقعات یاد کرانے کی کوشش کی گئی اور اب جو سنگین صورت حال بن چکی تھی، یہ بالکل 1947ء جیسی تھی۔ یہاں مصنف کی مجبوری تھی کہ وہ حال کو ماضی کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتا، تاکہ قاری کے لیے صورت حال کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ بستی کے ذریعے انتظار حسین نے قاری کو چند سوالات سوچنے پر مجبور کر دیا۔ فرانسس پریچٹ نے بستی کے انگریزی ترجمے کے تعارف میں اس حوالے سے لکھا ہے:

> Basti is a time one and thought provoking and unforgettably evocative at its best.[3]
>
> بستی ایک زمانہ ہے اور سوچ کو اُبھارنے والا اور اپنے بہترین طور پر ناقابل فراموش طور پر اشتعال انگیز ہے۔

علامتیں اور استعارے

انتظار حسین نے بجلی اور برقی قمقمہ کو روشنی کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں ایجادات انسان کی ترقی کا اشارہ ہیں۔ بجلی نہ صرف روشنی کا وسیلہ تھی، بلکہ دورِ حاضر میں حرکت کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ انتظار حسین نے بجلی کو نو آبادیات کی علامت کے طور استعمال کیا ہے۔ دیا کی جگہ برقی قمقمے نے لی تو یہ ایک روایت کے ختم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح

حقہ کی جگہ پر سگار اور سگریٹ نے لے لی۔ حقہ چوپال، ڈیرہ یا بیٹھک کی یاد دلاتا ہے، جہاں لوگ اکٹھے ہوتے اور باری باری کش لیتے اور معاملات کو زیر بحث لاتے سگریٹ اور سگار نے ان میں دوری پیدا کر دی۔ ہر چیز کی طرح انسان بھی جدا جدا ہو گئے۔ تہذیب زوال آمادہ نظر آنے لگی۔ یہاں تک تو تمدنی زندگی میں جو زوال آسکتا تھا وہ آچکا تھا، بعد ازاں تقسیم اور ہجرت نے زوال کے اس عمل کو اور تیز کر دیا۔ انتظار حسین نے ناول میں تجسیم کاری کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے، ہر چیز حتیٰ کہ مناظر فطرت کو بھی کہانی میں ایک جیتا جاگتا کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ جنگل، پرندے، کھنڈرات اور جانوروں کو بطور کردار یوں پیش کیا ہے کہ بعض جگہ پر انسان کی نسبت جانوروں کے کردار زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں۔ علامتوں کے استعمال کے علاوہ تشبیہات بھی انتظار حسین کے اُسلوب میں بہترین انداز میں استعمال ہوئی ہیں۔ ان کی نثر میں استعمال ہونے والی تشبیہات منفرد ہیں اور نثر کے اُسلوب کی دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ان کے ہاں ماضی کا کرب نمایاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیہات میں بھی یہی کرب جھلکتا ہے۔ انتظار حسین کے اُسلوب میں تشبیہات کا استعمال بھی انفرادیت کا حامل ہے۔ بستی میں بھی ان کی تشبیہات میں یادِ ماضی اور آنکھوں کی نمی محسوس ہوتی ہے۔ ناول بستی سے مثال ملاحظہ ہو۔

> اپنی یادوں کے منطقے سے واپس آیا، جیسے سوتے سوتے دفعتاً کوئی جاگ اٹھے، مگر نیند اسی طرح آنکھوں میں بھری ہو۔[4]

> مولانا محمد علی اللہ اللہ، جب بولتے تھے تو لگتا تھا، انگارے برس رہے ہیں۔[5]

تشبیہات اور محاورات

بستی کے اُسلوب میں تشبیہات کے علاوہ محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ محاورے ان کے اُسلوب کو خوب صورت بناتے ہیں۔ محاورات کے استعمال میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے گھریلو زندگی میں بولی جانے والی زبان میں بہترین محاورے ناول کے اُسلوب کا حصہ بنائے ہیں۔ وہ محاورات کو گھریلو بولیوں میں یوں سمو دیتے ہیں کہ وہ تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں اور کہیں بھی کوئی بناوٹی انداز معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں محاورات کا استعمال ملاحظہ ہو کہ کس طرح وہ گھریلو زندگی کی زبان میں محاورات کا حسین امتزاج کرتے ہیں۔

> وہاں پر کیا اوقات تھی، یاں آکر گنجے کو ناخون مل گئے۔[6]

یہاں سادگی اور پرکاری دونوں کا احساس ہوتا ہے۔ قاری کو اس اُسلوب میں ابلاغ کے مسائل کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا، بلکہ ناول نگار اسی اُسلوب کی بنا پر اسے عام خیالات سے نکال کر کائنات کی حقیقتوں کی طرف سفر کرنے پر آمادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول بستی میں انتظار حسین نے زیادہ تر ان شخصیات کو یاد کرایا ہے، جو وقت کے دھندلکوں میں گم ہو کر فراموش ہو گئیں تھیں۔ اس عمل میں انسان کی یادداشت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انتظار حسین کے خیال میں یاد داشت انسان کے لیے انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد قرار پاتی ہے۔ انھوں نے مختلف یادوں، قصوں اور تہذیبی روایات کے منفرد اندازِ بیان سے اپنے اُسلوب کو مزین کیا ہے۔ اس اُسلوب میں قاری کو ایک ایسی کسک کا بھی احساس ہوتا ہے، جو انہی گم شدہ انسانوں اور چیزوں کی یاد سے ابھرتی ہے۔ ان کے ناولوں میں گم شدہ مقامات اور بھلا دیے گئے رشتوں کی کسک انسان کو کس طرح بے چین کرتی ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا۔ روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔ کچے پکے راستے جو جانے کہاں جا کر نکلتے تھے، بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈولتے، ہچکولے کھاتے اکے، اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں، کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں آویزاں گھنٹیوں اور گھنگروؤں کی

بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے تھے۔ کالا مندر کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل، کربلا کی ویران اور اداس فصیل ٹیلوں والا قلعہ، راون بن، راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا برگد، بس ایک پورا دیومالائی عہد جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔[7]

سادگی اور علامتی انداز

کھوئی ہوئی چیزوں کو یاد کرنے کا جو اُسلوب انتظار حسین نے متعارف کرایا ہے، اُردو ناول میں اسلوبی سطح پر اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ کسی چیز کے کھو جانے کی یاد کو محض اس چیز تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ایک پورا منظر نامہ تشکیل دے دیتے ہیں اور اُسلوب کے ذریعے وہ قاری پر یہ منکشف کرتے چلے جاتے ہیں کہ اس ایک چیز کے کھو جانے سے انسان کو کس کس چیز سے محروم ہونا پڑا ہے۔ ایک چیز کے ساتھ کئی چیزوں کے کھو جانے کا بیان ناول بستی میں کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہاں چیزوں کے تصورات بھی عام آدمی کے تصور سے منفرد ہیں۔ ان کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ ناول کا ایسا اُسلوب تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے، جس کے ذریعے وہ ان منفرد تصورات کو قاری تک پہنچانے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ وہ پہلے اثباتِ ذات کراتے ہیں اور پھر اس امر کو سامنے لاتے ہیں کہ ایک چیز کے کھو جانے سے کیا کچھ کھو جاتا ہے۔ انتظار حسین کے اُسلوب سے اس کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

شاکیہ منی نے جاتک سنائی، بھکشوؤں کو دیکھا اور کہا اے بھکشوؤ! جانتے ہو وہ راجہ ہنس کون تھا؟ وہ راج ہنس میں تھا۔[8]

مجھے اپنے گم شدہ پیڑ یاد آ رہے تھے، گم شدہ پیڑ، گم شدہ پرندے، گم شدہ صورتیں، نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا، صابرہ، لمبے چھوٹے نیم کی نبولی، پکی، ساون کب آئے گا۔ بوندوں سے بھیگے گال پر گری ہوئی گیلی لٹ، جیوتے میری ماں کا جایاڈوالی بھیج بلاوے گا، دور سے پیڑ سے آتی ہوئی کوئل کی آواز۔[9]

علامتی اور اساطیری انداز

ایک روانی ہے، جو ان کے اُسلوب کو آگے ہی آگے لیے جا رہی ہے۔ وہ دیومالائی اور اساطیری قصے بھی اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو گراں بھی نہیں گزرتا اور وہ اُسلوب کا ایک نیا ذائقہ چکھنے لگتا ہے۔ اس عمل میں وہ روزمرہ کی ضرب الامثال اور محاورات کو بھی مہارت سے استعمال کرتے جاتے ہیں۔ ان کے اُسلوب میں ماضی کو بیان کرنے کے لیے اساطیری اور دیومالائی اُسلوب کے علاوہ استعاراتی اور علامتی اُسلوب بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں بہت سی علامتیں استعمال کی ہیں، لیکن ان کے ہاں استعمال ہونے والی علامتوں اور استعاروں میں سادگی اور عام فہم انداز پایا جاتا ہے۔ یہ سادہ اور عام فہم علامتیں نہ تو کہانی کے معنی کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور نہ ہی قاری کو تحریر میں کوئی ثقل نظر آتا ہے۔ وہ ان علامتوں کے ذریعے نثر کو باوزن بناتے ہیں اور اختصار کے ساتھ حقائق سے آگاہی دلاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

میں جب گھر سے چلا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ بیس اکیس کے لپیٹے میں تھا، جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا۔ پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔[10]

ہجرت کا جو کرب انتظار حسین کے ہاں علامتی انداز میں بیان ہوا ہے، تقسیمِ ہند کے وقت کون ہو گا، جو اس کرب سے نہ گزرا ہو گا۔ سر کے سیاہ بالوں کے ساتھ نکلنا گویا جوانی اور سرمستی کے ساتھ نکلنا ہے اور اس حالت میں کہ گھر والے بھی سب ساتھ ہیں اور جب منزل مقصود پر پہنچنا تو سیاہ کی جگہ سفید بالوں سے سر کا بھر جانا اور تنہا ہو جانا، اس کرب کو جھیلنے کو ظاہر کر رہا ہے، جو تقسیمِ ہند کے بعد سب مہاجرین نے جھیلا تھا۔ بالوں کی سفیدی بڑھاپے کے علاوہ غم کی علامت بھی سمجھی جاتی ہے۔ انتظار حسین نے یہاں انہی معنوں میں سر کے سفید بالوں کی علامت کو استعمال کر کے ایک لمبے اور تکلیف دہ سفر کو علامتی انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے جہاں ناول کے جملوں میں اختصار پیدا ہوا ہے، وہاں معنوی وسعت بھی پیدا ہوئی ہے۔

سادگی اور معنوی وسعت

انتظار حسین کے ہاں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، ان میں معنوی وسعت بہت زیادہ ہے۔ یہ ان کے اُسلوب کا اعجاز ہے کہ وہ عام فہم علامات کو بھی منفرد انداز میں استعمال کرنے پر مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے ناول ایسی علامتوں سے بھرے ہوئے ہیں، جو ناول کی کہانی کو اختصار میں رکھنے کے باوجود وسعت عطا کرتی ہیں۔ ذیل میں ان کے علامتی اُسلوب کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

> چوہے تو دم پر کیوں کھڑا ہے، حساب تو مجھے لینا ہے، بس مجھے بانسری کا انتظار ہے۔[11]
>
> مولوی دیا سلائی؟ وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟ نہ کسی سے بات کرنا، نہ بولنا، اپنے آپ میں گم، ان ماچس کی ڈبیوں میں جو خالی اور ادھ کھلی سامنے بچھی ہوئی بساط پر پڑی رہتیں۔ مولوی دیا سلائی یہ ڈبیاں کیسی ہیں؟ بابو جی یہ بستیاں ہیں۔ مولوی دیا سلائی ان میں تیلیاں تو ہیں ہی نہیں، سب خالی ہیں۔ بابو بستیاں خالی ہو گئیں۔[12]

اُسلوب میں علاقائی زبانیں

انتظار حسین کے ناولوں میں علاقائی زبانوں کا عمل دخل ان کے اُسلوب کو نمایاں کرتا ہے۔ انتظار حسین ہندوستان میں رہے۔ خاص طور پر قاری اس علاقے کے گیتوں سے اس علاقے کے تہذیبی مزاج سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔ وہ مقامی گیتوں سے یوں اُسلوب کو رعنائی بخشتے ہیں کہ اُسلوب حقیقت کے قریب ترین نظر آتا ہے۔ وہ علاقہ جس کی کہانی ناول میں بیان کی جا رہی ہوتی ہے، وہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ناول میں جھلکنے لگتا ہے۔ قاری اس علاقے کے گیتوں سے اس علاقے کے تہذیبی مزاج سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔

اماں آڑو جامن گلے دھرے
اماں میں نہیں کھاؤں میری ماں
اماں دھانی جوڑا سلا دھرا
اماں میں نہیں پہنوں میری ماں
اماں ساجن ڈولا لیے کھڑا
اماں میں نہیں جاؤں میری ماں
دیکھو شام نہیں آئے، گھیری آئی بدری
ایک تو کالی رات اندھیری برکھا برسے بیری بیری[13]

انتظار حسین کا یہ اُسلوب ناول کے اسالیب کو نئی سمتوں میں رواں کرتا ہے۔ ان کے ہاں نہ لفظوں کی کمی ہے اور نہ الفاظ کو استعمال کرنے کے سلیقے کا کوئی قحط ہے۔ ان کے اُسلوب میں ماضی کو بیان کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ماضی کے بیان کے لیے تاریخ، مذہب، نسلی اثرات، دیومالا، حکایتیں، داستانیں اور عقائد وتوہمات سب کو استعمال کیا ہے۔ ان سب کے استعمال کا سلیقہ ان کے ناولوں کے اُسلوب سے جھلکتا ہے۔ ان کا اُسلوب داستانوی اور اساطیری انداز بھی اختیار کرتا ہے، دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

> میں نے ایک طیب آدمی پر دو خبیث روحوں کو مسلط کرنے کی کوشش کی۔ میں نے گناہ کیا ہے، اے اچھے آدمی مجھے معاف کر دے۔[14]

> تو آئے متر! سمئے بیت رہا ہے، ہم سب سمئے کی زد میں ہیں تو بس جلدی کر اور آجا، آکر شہر دلی کو دیکھ اور شہر خوبی سے مل کہ دونوں تیرے انتظار میں ہیں، آ اور مل اس سے پہلے کہ اس کی مانگ میں چاندی بھر جائے اور اس سے پہلے کہ تیرا سر برف کا گالا بن جائے اور ہم کہانی بن جائیں۔[15]

انتظار حسین کے اُسلوب کی تشکیل میں ہجرت اور تاریخ ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں احمد صغیر لکھتے ہیں:

> انتظار حسین نے اپنے ناولوں میں ہجرت کو وسیع، تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کیا۔ بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے جیسے شاہکار ناول لکھ کر انھوں نے اہم ناول نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انتظار حسین کے ناول کا فکری محور تقسیم اور ہجرت ہے۔[16]

انتظار حسین کے اُسلوب میں بعض اوقات جنسی چٹخارہ بھی نظر آتا ہے، تاہم وہ اس کو بڑے احسن انداز میں پیش کرتے ہیں، جس جس فحشی کا عنصر نمایاں نہیں ہوتا۔ بستی میں وہ صابرہ کے خدوخال پیش کرتے ہوئے یوں مرقع کشی کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک خوش اسلوبی سے جنسی انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ صابرہ اب اتنی بڑی ہو گئی تھی اور سینہ اس کا کتنا ابھر آیا تھا کہ اب اسے وہ ہمیشہ دوپٹے سے ڈھانپے رکھتی تھی، پر وہ گول گول ابھار چھلکتے رہتے۔[17] انتظار حسین کی جنس نگاری کے حوالے سے ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں۔

> ۔۔۔۔۔۔۔۔۔عورت کے لیے جذبہ کی حسیاتی تجسیم بھی ایک اہم چیز ہے۔ خونی رشتوں کے علاوہ اگر وہ کسی اور سے رفاقت کی طالب ہو سکتی ہے تو وہ اس کا جنسی رشتہ ہے جو اس کے لیے طلب کل ہے۔ انتظار حسین کی عورت میں ایک طرح کا احساس برتری ہے اور اس کو حسیاتی اور جمالیاتی طور بلند کرنے کا اہتمام بھی ملتا ہے۔[18]

خلاصۂ بحث

انتظار حسین کا شمار اُردو ناول کے اُسلوب اور تکنیک میں نئے تجربات کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ انتظار حسین نے ناولوں کے اُسلوب میں جو تبدیلیاں کیں، ان میں سب سے اہم اسطوری واقعات اور دیومالائی قصے ہیں۔ انھوں نے اُسلوب کی سطح پر نئے تجربات کرتے ہوئے، اسلامی تاریخ کے مختلف واقعات کو بھی تلمیحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُسلوب کے دیگر لوازمات، مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ، علامت نگاری کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے اُسلوب میں انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔ انتظار حسین کا اُسلوب اصلیت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے ہاں اُسلوب کے حوالے سے جو پرانے عہد نامے، انجیل، قصص الانبیا، دیومالا، بودھ جاتکوں، داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات تک سب سے استفادہ کیا ہے اور ایک ایسا اُسلوب تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے ہیں، جو اردو ناول کا نیا اُسلوب کہلانے کا حق دار ہے۔ ان کے اُسلوب میں متنوع

خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف ان کے اُسلوب کی سادگی قاری کو اپنی طرف کشش کرتی ہے تو دوسری طرف مختلف علامتوں کے استعمال اور دیومالائی قصوں کے سبب ان کا اُسلوب خاصا تہہ دار اور پر پیچ بھی بن گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سادگی میں پرکاری کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

انتظار حسین کے پہلے ناول بستی میں اُسلوب کے جو شعوری تجربے ہوئے تھے، اگلے دونوں ناولوں تک آتے آتے انھوں نے ان علامتی اور استعاراتی اسالیب کو کافی حد تک سلاست میں بدل دیا ہے۔ ان کے ہاں ناول کے اُسلوب کے تمام تشکیلی عناصر کا عمل دخل ملتا ہے۔ اسی وجہ سے انھیں اردو کے صاحبِ اُسلوب ناول نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کا اُسلوب آنے والے ناول نگاروں کے علامتی اور تمثیلی انداز کے نئے راستے متعین کرتا ہے۔

حوالہ جات

[1] انتظار حسین، بستی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع دوم، 1984ء)، ص 1۔

[2] ڈاکٹر ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اُردو ناول ہیت، اسالیب اور رجحانات، انجمن ترقی اُردو 1997ء، ص 97۔

[3] Intizar Hussain, Translated by Francis-w prechet. Oxford University press, new Delhi, 2007, pg xxxviii.

[4] انتظار حسین، بستی، ص 38۔

[5] انتظار حسین، بستی، ص 56۔

[6] انتظار حسین، بستی، ص 156۔

[7] انتظار حسین، بستی، ص 41۔

[8] ایضاً، ص 145۔

[9] ایضاً، ص 90۔

[10] ایضاً، ص 47۔

[11] ایضاً، ص 55۔

[12] ایضاً، ص 114۔

[13] انتظار حسین، بستی، ص 289۔

[14] ایضاً، ص 69۔

[15] ایضاً، ص 128۔

[16] احمد صغیر، اُردو ناول کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد (دہلی: روشناس پرنٹرس، 2016ء)، ص 74۔

[17] انتظار حسین، بستی، ص 69۔

[18] ارتضیٰ کریم، انتظار حسین کی دبستان (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، 1996ء) ص 302۔303۔